ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



# شاہین مفتی کی شاعری میں تصور مرگ وحیات

***Ghulam Mustafa***
*PhD Scholar*
*Department of Urdu, Government College University, Faisalabad*
***Dr Sumaira Akbar (Correspondence Author)***
*Assistant Professor*
*Department of Urdu, Government College University, Faisalabad*

***Abstract:***
*The concept of life and death in Shaheen Mufti's poetry embodies a profound philosophical and existential vision. Her poetic expression portrays life as a journey of inner awakening, emotional struggle, and constant search for truth and meaning. Death, in her view, is not a tragic end but a natural transformation a gateway to spiritual continuity and eternal peace. Mufti's imagery often merges the ideas of life and death, presenting them as two inseparable forces in the cycle of existence. Through the use of symbols such as sleep, silence, and fading dreams, she reflects on the fragility and transience of human life. Her verses evoke a sense of melancholy blended with beauty, turning mortality into a source of reflection rather than despair. In this way, Shaheen Mufti's poetry becomes a philosophical meditation on the coexistence of life, death, and the eternal essence of the soul.*
***Keywords:*** *Shaheen Mufti, Philosophical and Existential Vision, Emotional Struggle Natural Transformation, Spiritual Continuity Eternal Essence.*

شاہین مفتی اردو ادب میں ایک معروف شاعرہ، مترجمہ، معلمہ اور ادبی ناقد کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ وہ اردو شعر و ادب میں ایک تانیثی نقاد کے طور پر مشہور ہیں جن کا تنقیدی رویہ سنجیدہ اور عمیق ہے۔ ان کے کلام میں وجودی، فکری اور احساساتی پس منظر نمایاں ہے۔ ڈاکٹر شاہین مفتی ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو سرگودھا کے مقام پر پیدا ہوئیں۔ پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز بطور استاد کیا اور پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین جلال پور جٹہ گجرات میں بطور پروفیسر اور پرنسپل خدمات سرانجام دیتی رہی ہیں۔ شاہین مفتی نے شاعری، تحقیق، تنقید، ترجمہ اور نثری تحریروں میں کام کیا۔ ان کی چند مشہور کتب میں "امانت"، "مسافت"، "پانی پہ قدم"، "انیس ناگی اردو کا اینٹی ہیرو"، "ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت اور فن" اور ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ "جدید اردو نظم میں وجودیت" نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ معاصر اردو نظم اور تنقید میں وجودی رجحانات (Existential Tendencies) کے حوالے سے ان کا کام اہم سمجھا جاتا ہے۔

شاہین مفتی کی نظموں میں مرگ وحیات کا تصور بہت باریکی، علامتی اور وجودی تشنگی سے سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری میں یہ دونوں عناصر ایک دوسرے کے متضاد تو ہیں مگر ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی تکمیل بھی ہیں۔ موت زندگی کی شدت کو بڑھاتی ہے اور زندگی موت کے خوف اور حقیقت کو محسوس کرنے کا موقع دیتی ہے۔ شاہین مفتی زندگی کے متعلق اپنے احساسات کو یوں بیان کرتی ہیں:

> "میں زندگی کے اور زندگی میرے تصرف میں ہے کبھی کبھی جب مفعولیت کا دورانیہ تر ہونے لگتا ہے تو وجود کو سنبھالا دینے کی خواہش جاگتی ہے۔ ایسے سے میں اپنے وجود کی تجربہ گاہ میں ایک چھوٹا سا دریچہ کھول دیتی ہوں تاکہ باہر کی فضا سے میرا ناطہ ٹوٹنے نہ پائے اور اندر کا حبس تنفس کے رشتے کو توڑنے کا اہل نہ ہو سکے۔"(1)

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



شاہین مفتی کی نظموں میں انسانی وجود، خواب، روح، فنا اور دوام جیسے تصورات کو نہایت فکری اور علامتی پیرایے میں پیش کیا ہے۔ زندگی ایک عارضی قیام ہے۔ ایک ایسے لمحے کی طرح جو گزرنے کے لیے آیا ہے۔ جبکہ موت ایک فطری و تدریجی عمل ہے۔ ان کے ہاں مرگ و حیات کا تصور صوفیانہ اور وجودی فکر کا حامل ہے۔

فصل گل
زندگی کے چمن زار سے
یوں روانہ ہوئی
نیند کی سرزمیں
بانجھ ہے اور اب
خواب کے نخل پر ایک پتہ نہیں(2)

شاہین مفتی کی نظم "جاگتی رتوں کا عذاب" زندگی، موت، امید اور تخلیقی زوال جیسے بڑے تصورات کو نہایت لطیف تصویروں میں پیش کرتی ہے۔ یہاں "فصل گل" زندگی میں موجود خوشی، امید، جوانی یا تخلیقی توانائی کی نمائندگی کرتی ہے۔ "زندگی کا چمن زار" خود حیاتِ انسانی یا دنیا کا استعارہ ہے۔ شاہین مفتی کہتی ہیں کہ زندگی کے اس باغ سے بہار رخصت ہو گئی ہے۔ وہ وقت گزر چکا ہے جو کبھی مہکتا تھا اب مرجھا چکا ہے۔ یہ مصرع وقت کے گزرنے اور حیات کی زوال پذیری کو بیان کرتا ہے۔ جیسے بہار کے بعد خزاں آتی ہے ویسے ہی زندگی میں بھی ایک وقت ایسا آتا ہے جب دل و دماغ بنجر ہو جاتے ہیں۔ "نیند کی سرزمین" ایک خوبصورت اور معنی خیز استعارہ ہے جو روح اور لاشعور کی سرزمین کو ظاہر کرتا ہے۔ جہاں انسان خواب دیکھتا ہے یعنی نئی امیدیں اور خواہشیں جنم لیتی ہیں۔ مگر شاعرہ کہتی ہیں کہ اب وہ سرزمین بانجھ ہو چکی ہے۔ اب نہ نیند میں نہ سکون باقی رہا ہے اور نہ خوابوں میں تازگی رہی ہے۔ انسان کے اندر کی زمین بیکار ہو چکی ہے اب اس میں کوئی تخلیقی جذبہ نہیں اگتا۔ یہاں شاہین مفتی وجودی المیے (Existential Despair) کو ظاہر کرتی ہیں۔ زندگی میں خواب نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ خوابوں کا نخل جو کبھی سرسبز و شاداب ہوتا تھا اب اس پر ایک بھی پتہ نہیں بچا۔ یہ تصویر زندگی میں موجود کامل ویرانی، مایوسی اور زوال کی منظر کشی کرتی ہے۔ یہ ایک ایسے انسان یا زمانے کا بیان ہے جس کے اندر زندگی کی حرارت اور تخیل کی روشنی مٹ چکی ہے۔ شاہین مفتی کی یہ نظم ایک مکمل روحانی و فکری علامتوں کا نظام بناتی ہے جو فنا اور زوال کے تصور کے گرد گھومتا ہے۔ یہ نظم زندگی کے معنوی خلا کی طرح روحانی موت اور خوابوں کی کمی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

دنیا
سرکس کا بھالو ہے
جو اندر سے خالی ہے
جو اس خالی بھالو سے
ڈر جاتا ہے
مر جاتا ہے(3)

یہ مختصر نظم "مشتری ہشیار باش" عصر حاضر کے انسان کی زندگی، دنیا کی حقیقت اور خوف کی فطرت پر ایک گہرا علامتی تبصرہ ہے۔ شاعرہ نے نہایت سادہ لفظوں میں وجودی، نفسیاتی اور فلسفیانہ خیال کو پیش کیا ہے۔ دنیا کو سرکس کے بھالو سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یعنی ایک ایسا مخلوقی منظر جو باہر سے طاقتور، بڑا اور خوفناک دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت میں ایک کھیل اور تماشہ ہے۔ "سرکس" دنیاوی زندگی کی ظاہری چمک تماشہ اور مصنوعی پن کی علامت ہے۔ دنیا کا باطن خالی ہے جس کے اندر کوئی سچائی، روح اور معنویت موجود نہیں۔ ظاہری ہلچل اور رونق کے باوجود یہ دنیا باطنی خلا سے بھری ہوئی ہے۔ یہ مصرع وجودی احساس، خلا اور انسانی زندگی کی بے معنویت کا اظہار ہے۔ آخری مصرعے اس نظم کے پیغام اور فلسفے کا نچوڑ ہیں۔ جو شخص اس خالی دنیا اور زندگی کے ظاہر سے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ وہ روحانی یا فکری طور پر مر جاتا ہے۔ یہاں موت جسمانی نہیں بلکہ باطنی موت ہے جو شخص اپنی آزادی، حریت فکر اور احساسِ سچائی کو کھو دیتا ہے۔ وہ روحانی طور پر مردہ ہے۔

دن کو
شب تک
لاتے لاتے
تن کی عمارت
ملبے کا اک ڈھیر ہوئی
---
نیند سے کہہ دو
جلدی آئے
خواب حسیں کا تحفہ لائے
اور پرانے ملبے سے
تعمیر کرے
اس کو
جس کو
کل بھی زندہ رہنا ہے(4)

نظم "دوسرا جنم" وقت، جسمانی تھکن، خواب اور نئی زندگی کی امید پر مبنی ایک نہایت حسین اور معنوی تخلیق ہے۔ شاہین مفتی نے زندگی کے دن بھر کے سفر کو جسم کی فرسودگی اور روح کی تجدید کے استعارے کے ذریعے بیان کیا ہے۔ روزمرہ زندگی کی مشقت اور جدوجہد انسان کو تھکا دیتی ہے۔ یہ روز کا دہرایا جانے والا عمل زندگی کی مسلسل جدوجہد کی علامت ہے۔ شاعرہ نے جسم کو "عمارت" کہا ہے۔ یعنی ایک ایسی ہستی جو وقت کے ساتھ ساتھ بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ ملنے کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ جسم وقتی ہے۔ فانی ہے اور دن کے اختتام پر موت کی ہلکی جھلک رکھتا ہے۔ وہ نیند سے التجا کرتی ہیں کہ وہ جلدی آئے۔ یہاں نیند صرف آرام نہیں بلکہ عارضی موت یا روحانی راحت کی علامت ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب جسم فنا کی طرف جاتا ہے اور روح کچھ دیر کے لیے آزاد ہو جاتی ہے۔ خواب ایک نعمت اور روحانی تحفہ ہیں جو زندگی کی تلخیوں سے وقتی نجات دلاتے ہیں۔ انسان کو امید اور حسن کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ حسین خواب انسانی زندگی کو نئے معنی عطا کرتے ہیں جس میں سکون، آس اور محبت ہو۔ پرانے ملبے سے نیا وجود تعمیر کرنا نظم کا سب سے طاقتور اور امید سے بھرپور حصہ ہے۔

شاہین مفتی کہتی ہیں کہ نیند اور خواب اس ٹوٹے جسم (ملبے) کو پھر سے تعمیر کریں تاکہ وہ انسان کل پھر سے جی سکے۔ یہ دراصل زندگی کی تجدید، امید کی بحالی اور روح کی تعمیر نو کا استعارہ ہے۔ نیند محض غفلت نہیں بلکہ تخلیق نو کا ذریعہ ہے۔ یعنی رات کی موت کے بعد صبح کی زندگی کا جنم ہوتا ہے۔ شاعرہ نے دن، رات، نیند اور خواب کو زندگی، موت، فنا اور بقا کے علامتی نظام میں جوڑ دیا ہے۔ پوری نظم فنا سے بقا تک کا ایک چکر (Cycle) بناتی ہے۔ شاہین مفتی دراصل زندگی اور موت کے توازن کی بات کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک موت یا نیند کوئی انجام نہیں بلکہ ایک نئی تخلیق کا پیش خیمہ ہے۔ یہ خیال صوفیانہ فلسفہ بقا فی الفنا سے جڑا ہوا ہے۔ یعنی فنا میں ہی زندگی کی بنیاد ہے۔ یہ صرف جسمانی تجربہ نہیں بلکہ ایک روحانی استعارہ بھی ہے۔ شاعرہ نے تھکن کے اندر بھی امید رکھی ہے اور فنا کے اندر بھی بقا کا بھی دکھایا ہے۔

موت
میرے آنگن میں

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



پاؤں پاؤں چلتی ہے
جانے کب بڑی ہو گی
کیسی وہ گھڑی ہو گی(5)

یہ مختصر نظم "کیسی وہ گھڑی ہو گی" موت کے تصور کو انسانی احساس، تجسس اور قبولیت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ شاہین مفتی نے چند سادہ الفاظ کے ذریعے ایک گہرے فلسفیانہ اور روحانی خیال کو بیان کیا ہے۔ یہ نظم ایک علامتی منظر بناتی ہے۔ شاعرہ موت کو ایک چپ چاپ، نرم قدموں سے آنے والی ہستی کے طور پر دیکھتی ہیں جیسے وہ اس کے گھر کے آنگن میں آہستہ آہستہ قدم رکھ رہی ہو۔ موت خاموشی سے انسان کے قریب آتی ہے۔ زندگی کے ارد گرد موت دبے پاؤں منڈلاتی ہے۔ موت کا یہ اظہار نہ خوف پر مبنی ہے اور نہ ہی انکار پر بلکہ ایک حیرت آمیز شعور اور قبولیت کا اشارہ ہے۔ کیونکہ موت زندگی کا حصہ ہے جو انسان کے قریب آجاتی ہے۔ موت کسی بھی وقت زندگی کو اپنی آغوش میں لے لے گی۔ یہ ایک نرم، انسانی اور بے خوف نقطہ نظر ہے۔ اس نظم میں موت کو دشمن نہیں بلکہ فطری بڑھوتری کے عمل کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ نظم کے اختتام پر شاہین مفتی تجسس کا اظہار کرتی ہیں کہ جب موت کا لمحہ آئے گا تو وہ لمحہ کیسا ہو گا۔ یہ سوال محض موت کا نہیں بلکہ زندگی کے انجام، حقیقت اور بعد از فنا وجود کا ہے۔

یہ نظم وجود اور فنا کے درمیان تعلق کو بہت سادہ مگر گہرے انداز میں پیش کرتی ہے۔ ایک اور جگہ شاہین مفتی مرگ و حیات کے تصور بیان کرتی ہیں:

گنہ کے معنی
بدل بھی دیں تو
سزا کی صورت
وہی رہے گی
خدا کا وعدہ
وہی رہے گا
فنا کی ہیبت
وہی رہے گی(6)

شاہین مفتی اپنی نظم "وبا کا موسم" میں زندگی، انسانی گناہ، فنا، موت، عدل اور الٰہی وعدے جیسے بڑے تصورات کو مؤثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ اس نظم میں زندگی کا ایک اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر انسان اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے گناہ کے معنی بدل دے تب بھی وہ حقیقت گناہ ہی رہے گا۔ گناہوں کا انجام، نتیجہ اور بدلہ نہیں بدل سکتا چاہے ہم گناہ کو کسی اور نام سے پکاریں، تاویلیں کریں مگر سزا اور انجام اپنی جگہ قائم رہے گا۔ نیکی پر جزا اور برائی و گناہ پر سزا کے بارے میں خدا نے جو وعدے کیے ہیں وہ اٹل ہیں۔ زمانہ نظریات اور انسان کے رویے سب بدل سکتے ہیں مگر خدا کا وعدہ کبھی نہیں بدلتا۔ آخر میں شاہین مفتی موت اور فنا کا ذکر کرتی ہیں۔ انسان دنیا میں چاہے کتنی بھی ترقی کر لے موت کا خوف ہمیشہ موجود رہے گا۔ فنا موت ایک اٹل حقیقت ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا۔ یہ نظم مذہب، اخلاق اور وجودی فکر تینوں کو جوڑتی ہیں۔

نظم کا پیغام یہی ہے کہ انسان وقتی طور پر اپنی اعمال کا جواز دے سکتا ہے مگر خدا کا نظام انصاف اور فنا کی حقیقت سے فرار ممکن نہیں۔ یہ نظم انسان کو زندگی میں اخلاقی بیداری اور خود احتسابی کی طرف بلاتی ہے۔

سب کچھ محوِ یاس ہوا
دل پھر اور اداس ہوا
اُس سے مل کر

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



آج مجھے احساس ہوا
وقت ایسا بھی کر جاتا ہے
لفظ تو زندہ رہتے ہیں
بس لہجہ مر جاتا ہے(7)

نظم "ایک اور سچ" میں انسانی احساسات کی موت، وقت کی بے رحمی، زندگی میں رشتوں کے بدلتے رنگوں، اداسی، یاد اور لہجے کی موت کو موضوع بنایا ہے۔ زندگی میں امید کا دیا جب بجھ دیائے تو دل غمگین ہو جاتا ہے۔ مایوسی کا مکمل غلبہ اور روحانی سناٹا جھلکتا ہے گویا شاہین مفتی کی زندگی درد اور خاموشی میں ڈوب چکی ہے۔ وہ وقت کی بے رحمی پر حیرت کا اظہار کرتی ہیں کہ وقت سب کچھ بدل دیتا ہے۔ احساسات، لہجے، چہرے اور رویے زندگی کی تلخیوں میں بدل جاتے ہیں۔ یہ مصرع فلسفیانہ رنگ رکھتا ہے جو وقت کی طاقت اور انسانی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔ الفاظ وہی رہتے ہیں باتیں، وعدے، گفتگو مگر ان کا لہجہ، جذبات، خلوص اور گرمی مر جاتی ہے۔ یہ دراصل رشتوں میں روح کے مر جانے کی علامت ہے۔ وقت انسانی زندگی میں صرف جسمانی فاصلے پیدا نہیں کرتا بلکہ روحانی تبدیلیاں بھی لاتا ہے۔ نظم کے بیان میں سادگی اور علامتیت کا حسین امتزاج ہے۔ اظہار باقی رہتا ہے مگر احساس مر جاتا ہے۔ یعنی انسان ظاہراً وہی رہتا ہے باطناً بدل جاتا ہے۔ یہ ایک وجودی (Existential) احساس ہے۔

یہ نظم محبت، وقت اور احساسات کی ناپائیداری کا نوحہ ہے۔ شاہین مفتی نے درد کو نہ چیخ کر بلکہ خاموشی میں بیان کیا ہے۔ ہر مصرع قارئین کو اپنی کسی بچھڑی یاد، کھوئی ہوئی گفتگو یا سرد لہجے کی یاد دلاتا ہے۔ یہ نظم ایک آئینہ ہے جس میں وقت کے ہاتھوں مرے ہوئے لہجوں کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ شاہین مفتی ایک اور نظم میں مرگ وحیات کے تصور کو ایک منفرد انداز میں یوں پیش کرتی ہیں:

میں جب مروں تو
مرے سرھانے
کوئی نہ رونا
نہ بین کرنا
نہ آہ بھرنا
خوشی منانا
دیا جلانا
یہ شبھ گھڑی ہے
کہ روح میری
عذاب جاں سے
رہا ہوئی ہے(8)

"وصیت" ایک خوبصورت اور گہرے معنی رکھنے والی نظم ہے جو ڈاکٹر شاہین مفتی کے اس تخلیقی و فکری جہان کی نمائندگی کرتی ہے جس میں زندگی، موت، روح اور رہائی جیسے تصورات نہایت حساس مگر باشعور انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ یہ نظم محض مرنے کے بعد کی کیفیت کا بیان نہیں بلکہ انسان کے روحانی ارتقا اور وجودی آزادی کی علامت ہے۔ شاہین مفتی موت سے خوفزدہ نہیں بلکہ اسے ایک پُرسکون فطری تبدیلی سمجھتی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ ان کی موت پر نوحہ نہ کیا جائے کیونکہ موت کوئی سانحہ نہیں بلکہ ایک تکمیل ہے۔ وہ روایتی سوگ اور غم کے اظہار کی نفی کرتی ہیں یعنی موت کے ساتھ انسانی معاشرت نے جو غم والم کی رسمیں جوڑ دی ہیں وہ ان سے بیزاری کا اظہار کر رہی ہیں۔ اس کے پیچھے ایک فلسفیانہ سکون ہے گویا شاعرہ جسمانی فنا کو روحانی

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT



آزادی کے مترادف سمجھتی ہیں۔ خوشی منانا، دیا جلانا، روحانی روشنی اور آغازِ نو کی علامت یہاں موت تاریکی نہیں بلکہ روشنی میں تبدیل ہونے کا لمحہ سمجھتی ہیں۔ دیا جلانا دراصل روح کے زندہ ہونے، اس کے تسلس اور نورانیت کی طرف اشارہ ہے۔

شاہین مفتی "شبھ گھڑی" کی اصطلاح استعمال کر کے ہندوستانی روحانیت کی فضا پیدا کرتی ہیں۔ موت کو شبھ گھڑی کہنا دراصل روحانی عروج کی علامت ہے۔ وہ لمحہ جب روح اپنے خالق یا اپنے اصل ماخذ سے جاملتی ہے۔ عذابِ جاں سے مراد زندگی کے دکھ، جدوجہد، خواہشوں کا بوجھ، تعلقات کی زنجیریں اور وہ سب روحانی و ذہنی مصائب ہیں جو انسان کو اس دنیا میں قید رکھتے ہیں۔ موت ان سب سے آزادی، مکتی، نجات اور سکون کا ذریعہ ہے۔ یہ نظم صوفیانہ اور وجودی فلسفے کا امتزاج ہے۔ موت فنا نہیں بلکہ وصال کا ذریعہ ہے۔ یہ سوچ صوفی شعرا کی روایت سے جڑی محسوس ہوتی ہے۔ زندگی محض تجربہ نہیں بلکہ مسلسل کشمکش ہے۔ لہٰذا موت ایک رحمتی رہائی کے طور پر سامنے آتی ہے جو زندگی کے دکھوں سے نجات دیتی ہے۔ اس نظم میں موت کو خوفناک یا المناک نہیں بنایا بلکہ اسے خوبصورت، پُرنور اور مقدس بنا دیا ہے۔ شاعرہ نے روحانی و جمالیاتی دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ نظم وجودی تسلیم (Existential Acceptance) کا مظہر ہے۔

شاہین مفتی زندگی کے دکھوں اور موت کی حتمیت دونوں کو قبول کرتی ہیں۔ وہ موت کے خلاف ایک نفسیاتی آزادی کا اعلان بھی ہے جیسے وہ اعلان کر رہی ہوں کہ انسان مر کر مکمل ہو جاتا ہے۔ موت فنا نہیں بلکہ آزادی ہے۔ جہاں غم نہیں روشنی ہے اور جہاں انسان اپنے دکھوں سے نکل کر روحانی سکون میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ نظم جدید اردو شاعری میں موت کے مثبت تصور کی بہترین مثالوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

## حوالہ جات

1۔ شاہین مفتی، امانت، لاہور: کتب خانہ نبیل، ۱۹۸۱ء، ص ۳
2۔ ایضاً، ص ۱۰
3۔ شاہین مفتی، مسافت، لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۹۸ء، ص ۵۳
4۔ ایضاً، ص 57-58
5۔ ایضاً، ص 59
6۔ ایضاً، ص 65
7۔ ایضاً، ص 72
8۔ ایضاً، ص 97-98